ALLAMA IQBAL OPEN UNIVERSITY

AIOU LIBRARY
aioulibrary.com

Name:

Registration No.:

Course Code: 2630

Program: M.A. Islamic Studies

Semester: Autumn 2026

WhatsApp Orders: +92 324 5836626

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

کلیہ عربی وعلوم اسلامیہ (شعبہ فکر اسلامی، تاریخ وثقافت)

کورس: مقاصد شریعہ (2630) • سطح: ایم اے علوم اسلامیہ

سمسٹر: خزاں 2026

امتحانی مشق نمبر 1 (یونٹ نمبر 1–5)

کل نمبر: 100 • کامیابی کے نمبر: 40

حل شدہ اسائنمنٹ گائیڈ

Reference &For Study — SOLVED ASSIGNMENT GUIDE

نوٹ: یہ گائیڈ صرف مطالعہ اور حوالے کے مقصد کے لیے تیار کی گئی ہے۔ طلبہ کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ کورس کی کتاب کے متعلقہ یونٹس غور سے پڑھیں، تصورات کو اچھی طرح سمجھیں اور پھر اسائنمنٹ اپنے الفاظ میں لکھیں۔ اس گائیڈ کو ہو بہو نقل کرنے کے بجائے اپنی فہم کے مطابق تحریر کریں۔ جہاں کسی دینی یا قانونی مسئلے میں قطعی رائے درکار ہو وہاں اہلِ علم اور مستند علماء کی طرف رجوع کریں۔

کورس کا تعارف اور اس مشق کا جائزہ

مقاصدِ شریعہ (2630) ایم اے علومِ اسلامیہ کا وہ کورس ہے جو طالب علم کو شریعت کے احکام کے پیچھے کارفرما مقاصد و مصلحتوں سے روشناس کراتا ہے۔ امتحانی مشق نمبر 1 (یونٹ نمبر 1 تا 5) میں پانچ سوالات دیے گئے ہیں جن میں سے ہر ایک 20 نمبر کا ہے؛ کل نمبر 100 اور کامیابی کے نمبر 40 ہیں۔ یہ سوالات شریعت کے مفہوم، محکوم فیہ، احصان، ثبوت و معاہدات اور بدعت جیسے بنیادی موضوعات پر مشتمل ہیں۔ اس گائیڈ میں ہر سوال کا جواب تعارف، ذیلی عنوانات، جدول و شکل اور اختتام کے ساتھ دیا گیا

ہے۔ حدود و سزاؤں سے متعلق مباحث خالصتاً علمی وضاحت ہیں؛ ان کا عملی اطلاق صرف اہل عدالت و ریاست کا اختیار ہے اور انفرادی معاملات میں مستند علماء سے رجوع کیا جائے۔ طالب علم ان جوابات کو سمجھ کر اپنے الفاظ میں لکھے تو یہی اس گائیڈ کا اصل مقصد پورا ہو گا۔

سوال نمبر 1: شریعت کا لغوی و اصطلاحی مفہوم اور شریعتِ اسلامیہ کے اصولی و بنیادی احکام (20 نمبر)

سوال نمبر 1۔ شریعت کا لغوی اور اصطلاحی مفہوم تحریر کریں، نیز شریعت اسلامیہ کے اصولی اور بنیادی احکام کو واضح کریں۔ (20)

تعارف

شریعت اسلامی زندگی کا وہ جامع نظام ہے جو انسان کو اس کے خالق، اس کے نفس اور پورے معاشرے کے ساتھ درست تعلق سکھاتا ہے۔ مقاصدِ شریعہ کے کورس کا مطالعہ اسی بنیادی سوال سے شروع ہوتا ہے کہ شریعت کہتے کسے ہیں، اس کا دائرہ کتنا وسیع ہے اور اس کے احکام کی بنیادی تقسیم کیا ہے۔ جب تک طالب علم شریعت کے مفہوم کو لغت اور اصطلاح دونوں اعتبار سے واضح نہ کر لے، آگے چل کر مقاصد، مصلحت اور حکم و علت کی بحث سمجھنا مشکل رہتا ہے۔ اس لیے اس جواب میں پہلے لفظ شریعت کی لغوی تحقیق پیش کی جائے گی، پھر فقہاء و اصولیین کی بیان کردہ اصطلاحی تعریفات کا خلاصہ دیا جائے گا، اس کے بعد شریعت کے مآخذ اور خصوصیات بیان ہوں گی اور آخر میں اس کے اصولی و بنیادی احکام یعنی عقائد، عبادات، معاملات، اخلاق اور حدود و تعزیرات کی ترتیب وار وضاحت کے ساتھ نتیجہ اخذ کیا جائے گا۔

یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ شریعت کو محض چند عبادات یا صرف قانونی دفعات کا نام سمجھنا اس کے جامع مفہوم کو محدود کر دیتا ہے۔ شریعت دراصل دین کا عملی نظام ہے جس میں عقیدہ، عبادت، معاشرت، معیشت، سیاست اور اخلاق سب شامل ہیں۔ اس کے احکام کا مقصد انسان کی دنیوی زندگی کو منظم کرنا اور اخروی کامیابی کی راہ دکھانا ہے۔ اصولیین نے احکام کو سمجھنے کے لیے حاکم، محکوم علیہ، محکوم فیہ اور حکم کی اقسام جیسی مباحث وضع کی ہیں جن کا ذکر اسی مشق کے دوسرے سوال میں آئے گا۔ لہٰذا یہ سوال پورے کورس کی بنیاد ہے اور اس کی اچھی تیاری آئندہ یونٹس کے لیے راہ ہموار کرتی ہے۔

شریعت کا لغوی مفہوم

لفظ شریعت عربی زبان کے مادہ شرع سے بنا ہے۔ عربی لغت میں شرع کے بنیادی معنی راستہ کھولنے، پانی کے گھاٹ کی طرف جانے والے واضح راستے اور کسی کام کو شروع کرنے کے آتے ہیں۔ قدیم عرب میں اس پختہ اور سیدھے راستے کو شریعہ کہا جاتا تھا جو پانی کے چشمے یا کنویں تک لے جاتا تھا اور جس پر چل کر انسان بغیر تردد کے اپنی منزل یعنی پانی تک پہنچ جاتا تھا، اور پانی زندگی کی علامت تھا۔ اسی مناسبت سے دین کے واضح راستے کو بھی شریعت کہا گیا جو انسان کو زندگی کی حقیقی منزل یعنی اللہ کی رضا اور آخرت کی کامیابی تک پہنچاتا ہے۔ قرآن مجید میں بھی یہ لفظ راستے اور طریقے کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے اور انبیاء علیہم السلام کے طریقوں کو شرائع کہا گیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر نبی کو اس کے دور کے حالات کے مطابق عملی احکام دیے گئے، اگرچہ توحید و رسالت کا بنیادی عقیدہ سب میں مشترک رہا۔

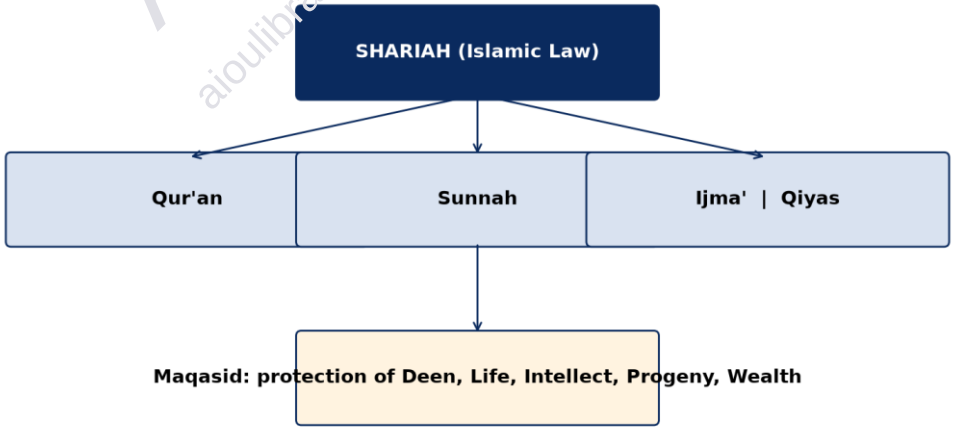
لغوی مفہوم سے شریعت کی تین خصوصیات خود بخود نکلتی ہیں۔ پہلی یہ کہ شریعت کوئی مبہم اور گول مول بات نہیں بلکہ ایک واضح اور متعین راستہ ہے جس کے حدود و قیود معلوم ہیں۔ دوسری یہ کہ یہ راستہ منزل تک پہنچانے والا ہے، یعنی اس پر چلنے کا ایک مقصد اور نتیجہ ہے، محض رسمی کارروائی نہیں۔ تیسری یہ کہ لغت میں شریعت کا تعلق پانی جیسی زندگی بخش چیز سے تھا، لہٰذا اصطلاحی شریعت بھی انسانی زندگی کے لیے حیات بخش نظام ہے جو فرد اور معاشرے دونوں کو زندگی، تحفظ اور سکون عطا کرتی ہے۔ یہی لغوی پس منظر بعد میں فقہاء کی اس تعریف کی بنیاد بنا کہ شریعت اللہ تعالیٰ کے وہ احکام ہیں جو اس نے اپنے بندوں کی ہدایت اور فلاح کے لیے نازل فرمائے۔

شریعت کا اصطلاحی مفہوم

اصطلاح میں شریعت سے مراد وہ تمام احکام و ہدایات ہیں جو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے ذریعے انسانوں تک پہنچائے ہیں اور جن پر عمل کرنا ہر مکلف کے لیے لازم ہے۔ فقہاء کی معروف تعریف کا خلاصہ یہ ہے کہ شرعی حکم اللہ تعالیٰ کا وہ خطاب ہے جو مکلفین کے افعال سے متعلق ہو اور جس میں کسی کام کا مطالبہ ہو، یا اس سے روکا گیا ہو، یا اختیار دیا گیا ہو۔ اس تعریف کی رو سے شریعت میں عبادات بھی شامل ہیں، معاملات و معاہدے بھی، خاندانی و سماجی قوانین بھی اور اخلاقی ہدایات

بھی۔ بعض علماء نے شریعت کو دین کے عملی پہلو کا نام دیا ہے، یعنی عقائد کا تعلق اصل دین سے ہے اور عمل و قانون کا حصہ شریعت کہلاتا ہے، مگر عام استعمال میں شریعت پورے عملی نظام کو شامل ہوتی ہے۔

شریعت اور فقہ میں فرق بھی اصطلاحی مفہوم ہی سے واضح ہوتا ہے۔ شریعت خود اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی ہدایت ہے، اس میں خطا کا امکان نہیں۔ فقہ انسانوں کی اس کوشش کا نام ہے جو وہ شریعت کے نصوص کو سمجھنے اور ان سے احکام مستنبط کرنے کے لیے کرتے ہیں، اس لیے فقہی اجتہاد میں اختلاف بھی ہوتا ہے اور زمانی تبدیلی بھی ممکن ہے۔ اسی طرح شریعت اور قانون میں بھی فرق ہے کہ ہر دنیاوی قانون صرف ظاہری عمل کو دیکھتا ہے جبکہ شریعت نیت، اخلاق اور آخرت کی جواب دہی کو بھی شامل رکھتی ہے۔ شریعت کی جامعیت، اس کا الٰہی ماخذ ہونا، انسان کی فطرت سے ہم آہنگی، اعتدال و توازن، آسانی و رفع حرج کا اصول اور ہر زمانے میں رہنمائی کی صلاحیت اس کی نمایاں خصوصیات ہیں جن کی بنا پر مسلمان اسے محض قانون نہیں بلکہ نظام حیات کہتے ہیں۔



شکل: شریعت کے بنیادی آخذ اور مقاصد کا خاکہ (مطالعے کے لیے)

شریعت کے مآخذ: ایک جائزہ

شریعت کے احکام کے بنیادی مآخذ چار ہیں جن پر اصول فقہ میں تفصیلی بحث ہوتی ہے۔ پہلا ماخذ قرآن مجید ہے جو اللہ تعالیٰ کا کلام اور احکام کا سب سے پہلا اور قطعی سرچشمہ ہے۔ دوسرا ماخذ سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے جو قرآن کی عملی تفسیر اور تشریح ہے اور قول، فعل اور تقریر تینوں صورتوں کو شامل ہے۔ تیسرا ماخذ اجماع امت ہے یعنی کسی مسئلے پر امت کے مجتہد علماء کا اتفاق، اور چوتھا ماخذ قیاس ہے جس میں کسی نئے پیش آمدہ مسئلے کو علت کی مماثلت کی بنا پر کسی منصوص مسئلے کا حکم دیا جاتا ہے۔ ان کے علاوہ استحسان، مصالح مرسلہ، سد ذرائع اور عرف جیسے ثانوی مآخذ بھی فقہی روایت میں استعمال ہوتے ہیں مگر ان کی حیثیت بنیادی چار مآخذ کے تابع ہے۔ اس ترتیب سے واضح ہوتا ہے کہ شریعت کوئی جامد مجموعہ نہیں بلکہ نصوص کی روشنی میں نئے مسائل کے حل کا باقاعدہ طریقہ کار بھی فراہم کرتی ہے۔

جدول: شریعت کے بنیادی مآخذ اور ان کا کردار

ماخذ	تعارف	احکام میں کردار
قرآن مجید	اللہ تعالیٰ کا قطعی کلام	عقائد، عبادات اور احکام کے اصل اصول
سنت رسول	قول، فعل اور تقریر نبوی	قرآن کی تشریح و عملی صورت
اجماع	مجتہدین امت کا اتفاق رائے	اختلافی مسائل میں اجتماعی فیصلہ
قیاس	علت کی بنا پر مماثلت سے حکم دینا	نئے مسائل کا شرعی حل

شریعت کے اصولی احکام

اصولی احکام سے مراد وہ بنیادی اصول و ضوابط ہیں جن کی روشنی میں تمام جزئی احکام سمجھے اور مرتب کیے جاتے ہیں۔ ان میں سب سے پہلے توحید کا اصول ہے کہ حاکم اعلیٰ اللہ تعالیٰ ہے، اسی لیے شرعی حکم کی اصل سند وحی ہے۔ دوسرا اصول عدل و انصاف کا ہے کہ ہر حکم میں حق دار کو اس کا حق ملنا مقصود ہے۔ تیسرا اصول مصلحت کا ہے کہ احکام

انسانوں کی حقیقی مصلحتوں کی حفاظت کے لیے ہیں، جیسا کہ اس کورس کا مرکزی موضوع مقاصد شریعہ بتاتا ہے کہ دین، جان، عقل، نسل اور مال کی حفاظت ہر حکم کی روح ہے۔

چوتھا اصول رفع حرج و آسانی ہے کہ شریعت انسان کو اس کی طاقت سے بڑھ کر مکلف نہیں بناتی اور ضرورت و مجبوری میں رخصت دیتی ہے۔ پانچواں اصول تدریج ہے کہ بہت سے احکام بتدریج نازل ہوئے تاکہ معاشرہ انہیں قبول کرنے کے قابل بنے۔ یہ اصول جزئی احکام کی تعداد سے زیادہ اہم ہیں کیونکہ نئے حالات میں انہی کی روشنی میں رہنمائی ملتی ہے۔

ان اصولی احکام کی موجودگی ہی سے شریعت میں وسعت اور لچک پیدا ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر جہاں نص خاموش ہو وہاں مصلحت اور عدل کے اصول کام دیتے ہیں، جہاں دو حکموں میں بظاہر تعارض نظر آئے وہاں ترجیح کے اصول مدد دیتے ہیں اور جہاں معاشرتی تبدیلی سے کسی حکم کی علت بدل جائے وہاں مقاصد کی روشنی میں نظر ثانی کی گنجائش رہتی ہے۔ البتہ یہ بھی یاد رہے کہ اصولی آزادی کا مطلب من مانی نہیں ہے؛ نصوص کی قطعی ہدایات ہر اصول سے مقدم ہیں اور اصول انہی نصوص کی خدمت کے لیے ہیں۔ اس توازن کو سمجھے بغیر نہ شریعت کی سختی کا درست اندازہ ہوتا ہے نہ اس کی نرمی کا، اس لیے اصولیین نے ان دونوں پہلوؤں کو ہمیشہ ساتھ ساتھ بیان کیا ہے۔

شریعت کے بنیادی احکام کی تقسیم

بنیادی احکام کو موضوع کے اعتبار سے عام طور پر چند بڑے شعبوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ پہلا شعبہ عقائد ہے جن کا تعلق ایمان، توحید، رسالت، آخرت اور تقدیر جیسے یقینی امور سے ہے؛ یہ شریعت کی بنیاد ہیں کیونکہ عمل کی قبولیت کا مدار عقیدے کی درستگی پر ہے۔ دوسرا شعبہ عبادات ہے جن میں نماز، روزہ، زکاۃ اور حج جیسے احکام شامل ہیں۔ عبادات کا مقصد اللہ سے تعلق مضبوط کرنا اور روحانی تربیت ہے۔ ان کے مقاصد کو سمجھا جا سکتا ہے مگر ان کی مقداریں اور صورتیں زیادہ تر تعبدی ہیں، یعنی جیسی بتا دی گئی ہیں اسی طرح ادا کی جاتی ہیں اور ان میں اپنی طرف سے کمی بیشی کی گنجائش نہیں ہوتی۔

تیسرا شعبہ معاملات ہے جس میں خرید و فروخت، کرایہ، شراکت، قرض، گروی اور معاہدوں جیسے مالی و سماجی روابط کے احکام آتے ہیں۔ چوتھا شعبہ احوال شخصیہ یعنی نکاح، طلاق، وراثت اور خاندانی حقوق کا ہے جو معاشرے کی سب سے چھوٹی اور اہم اکائی خاندان کو منظم کرتا ہے۔ پانچواں شعبہ اخلاقیات و آداب ہے جس میں سچائی، امانت، صلہ

رحمی، والدین کی خدمت اور عمومی حسن سلوک کے احکام شامل ہیں۔ چھٹا شعبہ حدود، قصاص اور تعزیرات کا ہے جس کا تعلق جرائم کی روک تھام اور نظم عامہ کی حفاظت سے ہے۔ ان سب شعبوں کا مجموعہ بتاتا ہے کہ شریعت انسان کی ذاتی، خاندانی، معاشرتی اور ریاستی زندگی سب کو محیط ہے اور کسی پہلو کو بھی رہنمائی سے خالی نہیں چھوڑتی۔

جدول: شریعت کے بنیادی احکام کی موضوعاتی تقسیم

اصل مقصد	نمایاں مثالیں	شعبہ
فکر و یقین کی درستگی	توحید، رسالت، آخرت پر ایمان	عقائد
اللہ سے تعلق اور روحانی تربیت	نماز، روزہ، زکاۃ، حج	عبادات
مالی انصاف اور اعتماد	بیع، اجارہ، شراکت، معاہدے	معاملات
خاندان کا استحکام	نکاح، وراثت، خاندانی حقوق	احوال شخصیہ
کردار سازی و حسن معاشرت	سچائی، امانت، صلہ رحمی	اخلاق و آداب
امن عامہ اور روک تھام	جرائم کی مقررہ و انتظامی سزائیں	حدود و تعزیرات

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ شریعت لغت میں پانی تک لے جانے والے واضح راستے کو کہتے ہیں اور اصطلاح میں یہ اللہ تعالیٰ کے ان تمام احکام کا نام ہے جو قرآن و سنت کے ذریعے انسان کی مکمل زندگی کی رہنمائی کے لیے دیے گئے۔ اس کے مآخذ قرآن، سنت، اجماع اور قیاس ہیں اور اس کے اصولی احکام میں حاکمیت الٰہی، عدل، مصلحت، رفع حرج اور تدریج جیسے بنیادی ضابطے شامل ہیں۔ اس کے بنیادی احکام عقائد، عبادات، معاملات، احوال شخصیہ، اخلاق اور حدود و تعزیرات کے شعبوں پر پھیلے ہوئے ہیں۔ مقاصد شریعہ کے طالب علم

کے لیے یہ مفہوم اس لیے مرکزی ہے کہ ہر جزئی حکم کے پیچھے کارفرما مقصد کو پہچاننا ہی اس کورس کا اصل سبق ہے، اور یہی پہچان شریعت کو محض احکام کی فہرست کے بجائے ایک حکیمانہ اور انسان دوست نظام کے طور پر سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔

سوال نمبر 2: محکوم فیہ — تعریف، شرائط اور احکام (20 نمبر)

سوال نمبر 2۔ "محکوم فیہ" سے کیا مراد ہے؟ اصولِ فقہ کی روشنی میں اس کی شرائط اور احکام پر ایک مفصل نوٹ تحریر کریں۔ (20)

تعارف

اصول فقہ کی بحث میں شرعی حکم کو سمجھنے کے لیے چار عناصر کا مطالعہ کیا جاتا ہے: حاکم یعنی حکم دینے والا جو اللہ تعالیٰ ہے، حکم خود یعنی اللہ کا خطاب، محکوم علیہ یعنی وہ مکلف انسان جس کو حکم دیا گیا، اور محکوم فیہ یعنی وہ فعل یا کام جس کے کرنے یا چھوڑنے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ سوال میں محکوم فیہ ہی زیر بحث ہے۔ اس موضوع کی اہمیت یہ ہے کہ ہر شرعی ذمہ داری کسی نہ کسی انسانی عمل کے گرد گھومتی ہے؛ جب تک یہ معلوم نہ ہو کہ مکلف سے کس عمل کا مطالبہ ہے، اس عمل کے شرعی درجے کیا ہیں اور اس کے صحیح ہونے کی شرائط کیا ہیں، تکلیف کا تصور مکمل نہیں ہوتا۔ اس جواب میں پہلے محکوم فیہ کی تعریف اور دائرہ بیان کیا جائے گا، پھر اس کی مشہور تقسیم عزیمت و رخصت اور وضعی تقسیمات، پھر اس کی شرائط اور آخر میں اس سے متعلق اہم احکام و قواعد کی وضاحت کے ساتھ نتیجہ پیش کیا جائے گا۔

یہاں یہ نکتہ بھی ذہن میں رہے کہ محکوم فیہ کی بحث خالص نظری بحث نہیں ہے۔ روزمرہ زندگی کا ہر کام، نماز روزے سے لے کر خرید و فروخت اور وعدے تک، اسی کے دائرے میں آتا ہے۔ کسی عمل کے موجود نہ ہونے، اس کے انسان کے اختیار سے باہر ہونے یا اس کے علم میں نہ ہونے کی صورت میں ذمہ داری کی نوعیت بدل جاتی ہے۔ اصولیین نے اسی وجہ سے محکوم فیہ کی شرائط بہت باریکی سے بیان کی ہیں تاکہ نہ انسان پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ پڑے اور نہ شرعی ذمہ داری بے مقصد سماجی رسم بن جائے۔ یہی قواعد آگے چل کر مقاصد شریعہ میں رفع حرج اور تکلیف بمایطاق کے اصولوں کی بنیاد بنتے ہیں۔

محکوم فیہ کی تعریف اور مفہوم

محکوم فیہ سے مراد وہ فعل یا عمل ہے جس پر شرعی حکم وارد ہوا ہو، یعنی وہ کام جس کے کرنے، نہ کرنے یا اختیار سے متعلق اللہ تعالیٰ کا خطاب ہو۔ مثال کے طور پر نماز پڑھنا، زکاۃ دینا اور سچ بولنا ایسے افعال ہیں جن کے کرنے کا مطالبہ ہے۔ مطلوب الفعل ہونے کے اعتبار سے محکوم فیہ ہیں۔ اسی طرح چوری، جھوٹ اور سود خوری ایسے افعال ہیں جن سے روکا گیا ہے، یہ بھی ممانعت کا موضوع ہونے کے اعتبار سے محکوم فیہ ہیں۔ بعض افعال ایسے ہیں جن میں مکلف کو اختیار دیا گیا ہے جیسے مباح کھانا پینا یا سفر کرنا، ان میں بھی خطابِ تخییر پایا جاتا ہے۔ لہٰذا محکوم فیہ کا دائرہ تمام انسانی اختیاری افعال تک وسیع ہے، خواہ وہ ظاہری جسمانی عمل ہو جیسے قیام و رکوع، قلبی عمل ہو جیسے نیت اور اخلاص، یا لسانی عمل ہو جیسے ذکر و گواہی۔

اصولیین کے ہاں فعل سے مراد محض جسمانی حرکت نہیں بلکہ ارادے کے ساتھ انجام دیا گیا عمل ہے۔ سوتے میں، بے ہوشی میں یا زبردستی میں ہونے والی حرکت عام طور پر تکلیف کا موضوع نہیں بنتی کیونکہ اس میں قصد و اختیار نہیں پایا جاتا۔ اسی طرح مکلف کے اپنے فعل کے علاوہ بعض اوقات اس کے فعل کے نتیجے اور سبب کو بھی حکم سے جوڑا جاتا ہے، جیسے کسی جائز کام کے ذریعے ہونے والا نقصان یا کسی معاہدے کے نتیجے میں پیدا ہونے والے حقوق۔ فقہاء نے اس ضمن میں براہِ راست عمل اور سبب بننے والے عمل میں بھی فرق کیا ہے۔ ان باریکیوں سے معلوم ہوتا ہے کہ محکوم فیہ کی تعریف اگرچہ مختصر ہے مگر اس کی جزئیات پورے نظامِ فقہ کو متاثر کرتی ہیں، خصوصاً عبادات کی صحت، معاملات کے نفاذ اور جرائم کی ذمہ داری کا تعین اسی پر موقوف ہے۔

محکوم فیہ کی بنیادی تقسیم: عزیمت اور رخصت

محکوم فیہ کی ایک مشہور تقسیم عزیمت اور رخصت کی ہے۔ عزیمت سے مراد وہ اصل حکم ہے جو ابتدائی طور پر تمام مکلفین کے لیے عام حالات میں مشروع کیا گیا ہو، جیسے پانچ وقت کی نماز پڑھنا، رمضان کے روزے رکھنا اور حرام چیزوں سے بچنا۔ رخصت سے مراد وہ سہولت والا حکم ہے جو کسی عذر، مشقت یا ضرورت کی بنا پر اصل حکم کے بالمقابل دیا گیا ہو، جیسے سفر یا بیماری میں روزے کی رخصت، مسافر کے لیے نماز کا قصر اور مجبوری کی حالت میں بقدرِ ضرورت ممنوع چیز کے استعمال کی اجازت۔ رخصت شریعت کی آسانی

اور رفع حرج کی دلیل ہے اور یہ اسی محکوم فیہ کے دائرے کو حالات کے تابع کر کے زندگی کو قابل عمل رکھتی ہے۔ الٰہی حکمت یہ ہے کہ عزیمت اصل قاعدہ رہے اور رخصت استثنائی سہولت، تاکہ نہ سختی انسان کو دین سے دور کرے اور نہ ہر خواہش کو رخصت کا نام دے کر احکام معطل ہو جائیں۔

رخصت کے استعمال میں اعتدال کی شرط فقہاء بار بار دہراتے ہیں۔ جس عذر کی بنا پر رخصت دی گئی ہے اس کے ختم ہوتے ہی عزیمت کی طرف لوٹنا اصل ہے۔ اسی طرح رخصت کو ذاتی آسانی پسندی سے نہیں بلکہ شرعی معیار سے ناپا جائے گا، کیونکہ عام تھکن یا معمولی تکلیف ہر حکم میں رخصت کا سبب نہیں بنتی۔ اس تقسیم کی ایک اور صورت یہ ہے کہ بعض رخصتیں کرنا اولیٰ ہوتی ہیں، بعض میں اختیار ہوتا ہے اور بعض حالات میں رخصت قبول کرنا دینی غیرت کے خلاف بھی سمجھا گیا ہے جیسے اکراہ کی حالت میں کلمہ کفر کے مسائل جہاں صبر کو افضل کہا گیا ہے۔ یہ تفصیلات بتاتی ہیں کہ محکوم فیہ محض قانونی شکل نہیں بلکہ مکلف کے حالات، نیت اور طاقت کو ساتھ لے کر متعین ہوتا ہے۔

محکوم فیہ کی شرائط

اصولیین نے محکوم فیہ کے لیے چند بنیادی شرائط بیان کی ہیں جن کے بغیر کسی فعل پر شرعی تکلیف صحیح طور پر مرتب نہیں ہوتی۔ پہلی شرط یہ ہے کہ فعل معلوم ہو، یعنی مکلف کو یہ جاننا ممکن ہو کہ اس سے کس کام کا مطالبہ ہے۔ مجمل اور مبہم مطالبے پر عمل ممکن نہیں ہوتا، اس لیے نصوص نے عبادات کی صورتیں اور معاملات کے اصول واضح کیے ہیں اور سنت نے ان کی عملی تشریح کی ہے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ فعل موجود یا مقدور الحصول ہو، یعنی وہ کام ایسا ہو جو واقع ہو سکے۔ معدوم، محال اور طبعی طور پر ناممکن کام کا مطالبہ تکلیف مالایطاق کہلاتا ہے جسے شریعت نے پسند نہیں کیا۔ تیسری شرط قدرت و استطاعت ہے کہ مکلف جسمانی، مالی اور ذہنی طور پر اس فعل کی طاقت رکھتا ہو، اسی بنا پر حج کے لیے استطاعت اور نماز میں قیام نہ کر سکنے والے کے لیے بیٹھ کر پڑھنے کی سہولت دی گئی ہے۔

چوتھی شرط یہ ہے کہ فعل مکلف کے اختیار میں ہو۔ جو کام انسان کے اختیار سے باہر ہو، جیسے دل میں اچانک آنے والے خیالات یا قدرتی آفات کے نتائج، ان پر براہ راست ممانعت یا سزا مرتب نہیں ہوتی، البتہ ان کے تدارک کے اختیاری اسباب اختیار کرنا الگ حکم رکھتا ہے۔ پانچویں شرط یہ ہے کہ فعل شرعاً معتبر ہو، یعنی اگر اس میں کوئی مفسدہ لازم آتا ہو یا وہ کسی قطعی ممانعت سے ٹکراتا ہو تو اس کی وہ صورت مطلوب نہیں رہتی۔ چھٹی شرط بعض افعال میں وقت اور سبب کا پایا جانا بھی ہے، جیسے نماز اپنے وقت کے اندر،

زکاۃ نصاب اور حولان حول کے ساتھ اور روزہ رمضان کے مہینے میں۔ ان شرائط کا مجموعی نتیجہ یہ ہے کہ شرعی تکلیف ایک منصفانہ اور قابل عمل نظام ہے جس میں علم، قدرت، اختیار اور موقع سب کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔

جدول: محکوم فیہ کی اہم شرائط اور ان کی مثالیں

شرط	مفہوم	مثال
علم و بیان	مطلوب عمل معلوم و واضح ہو	نماز و زکاۃ کی تفصیل سنت سے بیان ہونا
امکان	فعل واقع ہونے والا ہو	محال و ناممکن کام کا مطالبہ نہ ہونا
قدرت و استطاعت	مکلف اس کی طاقت رکھتا ہو	حج میں استطاعت، مریض کے لیے رخصت
اختیار	فعل ارادے و اختیار میں ہو	اضطراری و اکراہی حرکت کا جدا حکم
سبب و وقت	جہاں شرط ہو وہاں پایا جائے	زکاۃ میں نصاب، نماز میں وقت کی پابندی

محکوم فیہ سے متعلق اہم احکام و قواعد

محکوم فیہ سے متعلق چند اہم قواعد فقہی کتب میں بیان ہوتے ہیں۔ ایک قاعدہ یہ ہے کہ جو فعل کسی واجب کی تکمیل کے لیے ناگزیر ہو اس کا حکم بھی اسی کے تابع سمجھا جاتا ہے، جیسے نماز کے لیے وضو، کیونکہ مقصود تک رسائی ذریعے کے بغیر ممکن نہیں۔ دوسرا قاعدہ یہ ہے کہ امر کسی کام کے مطالبے کے ساتھ اس کے منافی کو ترک کرنے کو بھی مستلزم ہوتا ہے۔ تیسرا قاعدہ یہ ہے کہ تکلیف کے احکام میں غلبہ حال دیکھا جاتا ہے، یعنی قانون عام انسانوں کی عام استطاعت پر بنتا ہے اور استثنائی حالات رخصت سے حل ہوتے ہیں۔ چوتھا قاعدہ یہ ہے کہ عبادات میں اصل توقف ہے یعنی صورت وہی معتبر ہے جو شریعت نے بتائی، جبکہ معاملات میں اصل اباحت و رضامندی کے اصول کارفرما رہتے ہیں جب تک ممانعت نہ آئے۔ ان قواعد سے فقہاء روزمرہ کے پیچیدہ مسائل کو منظم انداز میں حل کرتے ہیں۔

ایک اور اہم بحث فعل کے حسن و قبح کی ہے۔ اصولیین کے ہاں یہ بحث ہوتی ہے کہ کسی فعل کا اچھا یا برا ہونا شریعت کے بتانے سے معلوم ہوتا ہے یا عقل بھی اس میں دخل رکھتی ہے۔ اس اختلاف کے عملی ثمرات محکوم فیہ کی تعبیر میں نظر آتے ہیں، مگر اس بات پر سب متفق ہیں کہ قطعی شرعی حکم کی موجودگی میں اسی کی اتباع واجب ہے۔ اسی طرح فعل کی صحت و فساد کی بحث بھی محکوم فیہ سے جڑی ہے؛ جو عبادت یا معاملہ اپنی شرائط کے مطابق ہو وہ صحیح، جس میں بنیادی رکن یا شرط مفقود ہو وہ فاسد یا باطل قرار پاتا ہے۔ یہ تمام احکام بتاتے ہیں کہ محکوم فیہ اصول فقہ کا زندہ اور عملی موضوع ہے۔ اس کے بغیر نہ عبادت کی درستگی جانچی جا سکتی ہے اور نہ معاملات و جرائم کی ذمہ داری متعین ہو سکتی ہے۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ محکوم فیہ مکلف کے اس اختیاری فعل کو کہتے ہیں جس پر شرعی حکم کا خطاب وارد ہو، خواہ وہ فعل کرنے کا مطالبہ ہو، ترک کرنے کی ممانعت ہو یا اختیار کی اجازت۔ اس کی بنیادی تقسیم عزیمت و رخصت ہے اور اس کی اہم شرائط میں عمل کا معلوم ہونا، ممکن ہونا، مکلف کی قدرت (استطاعت)، اختیار کا پایا جانا اور جہاں لازم ہو سبب و وقت کی موجودگی شامل ہیں۔ اس سے متعلق قواعد، جیسے مقدمہ واجب کا حکم، عبادات میں توقف اور معاملات میں وسعت، پورے فقہی نظام کو توازن عطا کرتے ہیں۔ مقاصد شریعہ کی نظر سے محکوم فیہ کی یہ شرائط خود ایک مقصد کی حفاظت کرتی ہیں کہ انسان پر اس کی وسعت سے بڑھ کر بوجھ نہ پڑے اور دین عملی زندگی میں آسانی و انصاف کے ساتھ نافذ ہو۔ طالب علم اگر ان شرائط کو مثالوں کے ساتھ ذہن نشین کر لے تو آئندہ آنے والے تکلیفی احکام کی تمام بحثیں اس کے لیے آسان ہو جاتی ہیں۔

سوال نمبر 3: احصان — مفہوم، ارکان اور محصن کی سزا (20 نمبر)

سوال نمبر 3۔ احصان سے کیا مراد ہے اور اس کے ارکان کون کون سے ہیں؟ شریعتِ اسلامیہ میں مُحصن (شادی شدہ زانی) کی سزا کیا ہے؟ جامع نوٹ لکھیں۔ (20)

تعارف

احصان حدود کی بحث کا ایک بنیادی تصور ہے جو زنا کی حد کے اطلاق میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اصطلاحی طور پر محصن اس شخص کو کہا جاتا ہے جس میں شریعت کی مقرر کردہ مخصوص شرائط جمع ہوں، اور اسی وصف کی بنا پر فقہاء کے [illegible] کی سزا کی نوعیت میں فرق آتا ہے۔ اس سوال میں احصان کا لغوی و اصطلاحی مفہوم، اس کے ارکان و شرائط کی فقہی تفصیل اور محصن زانی کی سزا پر جمہور فقہاء کا موقف دلائل کے [illegible] کے ساتھ بیان کیا جائے گا۔ واضح رہے کہ یہ جواب خالصتاً علمی و درسی وضاحت ہے؛ کسی فرد پر حد کا فیصلہ اور اس کا نفاذ ہر حال میں صرف اہل عدالت اور ریاستی اختیار کا کام ہے [illegible] اور تمام شرائط کی موجودگی کے ساتھ، اور عملی فتویٰ و فیصلے میں مستند علماء و اہل اختیار سے رجوع ہی شرعی طریقہ ہے۔ عام آدمی یا کسی گروہ کو خود سے کوئی سزا نافذ کرنے کا کوئی اختیار نہیں۔

اس موضوع کا مطالعہ مقاصد شریعہ سے بھی جڑا ہے۔ اسلام میں خاندان، عزت و آبرو اور نسل کی حفاظت بنیادی مقاصد میں شامل ہے، اسی لیے ازدواجی تعلقات کو نکاح کے پاکیزہ نظام میں رکھا گیا اور اس کے باہر کے تعلقات کو سختی سے روکا گیا۔ مگر اسی کے ساتھ ثبوت کے معیار کو بھی غیر معمولی حد تک [illegible] رکھا گیا تاکہ محض الزام، شبہ یا بدگمانی سے کسی کی زندگی برباد نہ ہو۔ فقہاء کا یہ اصول مشہور ہے کہ شبہات کی موجودگی میں حدود ساقط ہو جاتی ہیں، یعنی جہاں شک ہو وہاں حد نہیں لگائی جاتی۔ احصان کی شرائط کی پیچیدگی بھی اسی احتیاط کا حصہ ہے کہ سزا صرف اسی پر جاری ہو جس پر تمام پہلوؤں سے جرم شرعی معیار کے مطابق ثابت ہو۔

احصان کا لغوی و اصطلاحی مفہوم

احصان عربی لفظ حصن سے ماخوذ ہے جس کے معنی قلعہ، حفاظت اور روک کے ہیں۔ اسی مادے سے محصن کے معنی اس شخص کے ہیں جو کسی حفاظت و حصار میں ہو۔ لغوی مناسبت یہ ہے کہ نکاح انسان کو فحاشی سے روکنے والا حصار ہے اور جو شخص صحیح نکاح کے ذریعے اس حصار میں داخل ہو چکا ہو اسے محصن کہا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں محصنات کا لفظ پاک دامن اور شادی شدہ عورتوں کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے، جس سے احصان کے مفہوم میں پاک دامنی اور ازدواجی حیثیت دونوں شامل نظر آتے ہیں۔ عام لغوی استعمال میں احصان کا اطلاق آزادی، بلوغت اور حفاظت جیسے معانی پر بھی ہوا ہے، مگر حدود کی بحث میں یہ اصطلاح خاص شرعی مفہوم میں استعمال ہوتی ہے۔

اصطلاحِ فقہ میں محصن وہ بالغ، عاقل اور آزاد مسلمان ہے جس کا نکاح صحیح طور پر منعقد ہوا ہو اور اس نکاح میں میاں بیوی کے درمیان باقاعدہ ازدواجی تعلق یعنی دخول بھی واقع ہو چکا ہو۔ اس تعریف سے معلوم ہوتا ہے کہ محض نکاح کا کاغذی انعقاد کافی نہیں بلکہ فقہاء کی اکثریت کے نزدیک اس نکاح کا صحیح ہونا اور اس میں حقیقی ازدواجی زندگی کا آغاز بھی احصان کے قیام کے لیے لازم ہے۔ اسی طرح اگر نکاح فاسد ہو یا دخول سے پہلے علیحدگی ہو جائے تو احصان ثابت نہیں ہوتا۔ بعض فقہی مکاتب میں بعض جزئیات میں اختلاف پایا جاتا ہے، جیسے کسی شرط کے درجے میں نرمی یا سختی، مگر بنیادی عناصر پر اتفاق کے قریب صورت موجود ہے۔ ادارے کی درسی کتاب میں بیان کردہ روایت کو اصل سمجھا جائے اور تفصیلی اختلافات کے لیے فقہ کی مستند کتب اور اہل علم سے رجوع کیا جائے۔

احصان کے ارکان و شرائط

فقہاء نے احصان کے لیے عام طور پر پانچ شرائط ذکر کی ہیں اور انہی کو اس کے ارکان سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ پہلی شرط عقل ہے، یعنی شخص عاقل ہو؛ مجنون یا ایسا شخص جس کی عقل زائل ہو اس پر احصان کی یہ حیثیت مرتب نہیں ہوتی۔ دوسری شرط بلوغت ہے، یعنی وہ بالغ ہو؛ نابالغ پر نہ حد ہے اور نہ اسے محصن کہا جا سکتا ہے۔ تیسری شرط آزادی ہے، یعنی وہ آزاد ہو؛ تاریخی غلامی کے دور میں اس شرط کا اطلاق ہوتا تھا، موجودہ دور میں یہ شرط عملاً موجود نہیں کیونکہ غلامی ختم ہو چکی ہے، مگر فقہی کتب میں اس کا ذکر تاریخی نظام کے طور پر آتا ہے۔ چوتھی شرط اسلام ہے، یعنی جمہور کے نزدیک محصن کے وصف کے لیے مسلمان ہونا شرط ہے، اگرچہ بعض فقہاء کے ہاں اس جزئیے میں اختلاف بھی نقل ہوا ہے۔

پانچویں اور مرکزی شرط صحیح نکاح میں دخول ہے، یعنی اس شخص کا نکاح شریعت کے مطابق صحیح طور پر ہوا ہو اور اس کے بعد خلوت صحیحہ کے بعد ازدواجی تعلق قائم بھی ہوا ہو۔ اس شرط کا مقصد یہ ہے کہ جس شخص کو جائز ازدواجی زندگی میسر آ چکی ہو اور اس کے باوجود وہ حدود توڑے، اس کا جرم زیادہ سنگین سمجھا جائے کیونکہ اس کے پاس حلال راستہ موجود تھا۔ اس کے برعکس جس شخص کو یہ حیثیت حاصل ہی نہیں ہوئی اس کے بارے میں قانون نے الگ درجہ رکھا ہے۔ احصان کا ثبوت بھی آسان بات نہیں؛ فقہاء نے اس کے اثبات کے لیے بھی گواہی اور اقرار جیسے سخت ذرائع مقرر کیے ہیں۔ اگر ان شرائط میں سے کوئی ایک بھی مفقود ہو تو شخص محصن کے درجے سے گر جاتا ہے اور اس پر محصن

والی سزا کسی صورت جاری نہیں ہو سکتی۔اس تفصیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ احصان ایک تکنیکی فقہی وصف ہے جس کا تعین جذبات یا سماجی تاثر سے نہیں بلکہ دقیق شرائط سے ہوتا ہے۔

جدول: احصان کی شرائط (ارکان) کا خلاصہ

شرط	مفہوم	نوٹ
عقل	شخص عاقل ہو	مجنون اس وصف سے خارج ہے
بلوغت	شخص بالغ ہو	نابالغ پر حد نہیں
آزادی	شخص آزاد ہو	تاریخی شرط؛ موجودہ دور میں غلامی ختم ہو چکی ہے
اسلام	شخص مسلمان ہو	اس جزیئے میں بعض فقہاء کا اختلاف نقل ہوا ہے
صحیح نکاح و دخول	صحیح نکاح میں ازدواجی تعلق واقع ہو	محض نکاح کافی نہیں؛ دخول بھی شرط ہے

محصن زانی کی سزا: فقہی موقف

جمہور فقہاء کے نزدیک اگر کسی محصن مرد یا عورت پر زنا کا جرم شرعی ثبوت کے مکمل معیار کے ساتھ ثابت ہو جائے تو اس کی حد رجم یعنی سنگسار ہے۔یہ موقف سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے عملی فیصلوں اور صحابہ کرام کے تعامل کی بنیاد پر جمہور امت کا متفقہ علمی موقف شمار ہوتا ہے اور چاروں مشہور فقہی مذاہب کی مستند کتب میں یہی لکھا ہے۔اس کے بالمقابل غیر محصن یعنی وہ شخص جس میں احصان کی شرائط نہ پائی جاتی ہوں،اس کی حد قرآن مجید کی سورہ نور میں بیان کردہ سو کوڑے ہے۔دونوں صورتوں میں اہم بات یہ ہے کہ یہ بحث صرف اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب جرم اس غیر معمولی سخت ثبوت سے ثابت ہو جس کی تفصیل فقہ میں موجود ہے،یعنی چار عادل چشم دید مرد گواہ یا مجرم کا بلا جبر

واکراہ خود اپنا واضح اقرار جو عدالت کے سامنے ثابت رہے۔ عملی زندگی میں اس معیار کا پورا ہونا انتہائی مشکل رکھا گیا ہے تاکہ عزت و آبرو محفوظ رہے اور سزا کا اصل مقصد عبرت وروک تھام تک محدود رہے۔

یہاں چند احتیاطی اصول دہرانا ضروری ہے جو اس باب کی روح ہیں۔ پہلا یہ کہ شبہ سے حد ساقط ہو جاتی ہے؛ اگر ثبوت میں، اقرار میں یا احصان کی کسی شرط میں شبہ پیدا ہو جائے تو حد روک دی جاتی ہے۔ دوسرا یہ کہ اقرار کرنے والا اگر اپنے اقرار سے رجوع کر لے تو جمہور کے نزدیک اس کا رجوع قبول کر کے حد ساقط کر دی جاتی ہے۔ تیسرا یہ کہ اس کا نفاذ صرف حکومت و عدالت کا کام ہے؛ کوئی فرد، خاندان یا بھیڑ خود سے اس فیصلے پانفیذ کی مجاز نہیں، ایسا کرنا خود جرم اور فساد ہے۔ چوتھا یہ کہ اگر جرم حد کے معیار سے ثابت نہ ہو مگر قرائن سے بے راہ روی ثابت ہو تو معاملہ تعزیر کے دائرے میں اہل عدالت کے پاس جاتا ہے، جس میں سزا کا تعین عدالت قانون و حالات کے مطابق کرتی ہے۔ ان اصولوں کے بغیر اس سزا کا ذکر کرنا اس موضوع کی ادھوری اور خطرناک تصویر پیش کرتا ہے، اس لیے درسی بحث میں انہیں لازمی جزو سمجھا جائے۔

احصان کے تصور کی حکمتیں

احصان اور غیر احصان میں سزا کا فرق رکھنے کی حکمت فقہاء نے یہ بیان کی ہے کہ جس شخص کو نکاح کے ذریعے حلال اور باعزت ازدواجی زندگی میسر ہو اس کے بعد حرام کی طرف جانا زیادہ بڑی خیانت ہے، کیونکہ اس میں صرف اپنی خواہش کی خلاف ورزی ہی نہیں بلکہ شریک حیات کے حقوق، خاندان کے اعتماد اور معاشرتی نظم کی توہین بھی شامل ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس شریعت نے اس درجہ بندی کے ساتھ ساتھ ستّاری، توبہ اور ستر پوشی کی بھی ترغیب دی ہے اور گناہ کے اعلان کو پسند نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ احادیث کی تعلیمات میں اپنے گناہ چھپانے اور توبہ کرنے کی فضیلت آئی ہے اور شریعت کا مزاج سزا دینے کی جلدی کا نہیں بلکہ اصلاح اور پردہ پوشی کا ہے۔ اصل میں حد کی شدت نشان عبرت ہے جبکہ اس کے ثبوت کی شدت رحمت و احتیاط ہے، اور دونوں مل کر مقاصد شریعہ میں سے عزت و نسل کی حفاظت کو پورا کرتی ہیں۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ احصان حفاظت وحصار کے معنی سے نکلا ایک فقہی وصف ہے اور محصن وہ بالغ، عاقل، آزاد مسلمان ہے جس کا صحیح نکاح میں زوجین کا باقاعدہ تعلق واقع ہو چکا ہو۔ اس کی پانچ شرائط میں سے کوئی ایک بھی مفقود ہو تو یہ وصف ثابت نہیں ہوتا۔ جمہور فقہاء کے نزدیک ثابت شدہ جرم کی صورت میں محصن زانی کی حد رجم ہے جبکہ غیر محصن کی حد سورہ نور میں مذکور سو کوڑے ہے، لیکن اس پورے نظام کی بنیاد سخت تر ثبوت، شبہ سے حد کا سقوط اور صرف عدالت و ریاست کے اختیار پر ہے۔ کسی بھی عملی کیس میں رائے عامہ یا خود ساختہ کارروائی کی کوئی گنجائش نہیں؛ فیصلہ صرف اہل عدالت کا ہے اور مشورہ صرف مستند علماء کا۔ اسی احتیاط اور علمی امانت کے ساتھ اس موضوع کو پڑھنا اور لکھنا اس جواب کا مقصود ہے۔

سوال نمبر 4: شریعتِ اسلامیہ میں ثبوت اور معاہدات کے نظریات (20 نمبر)

سوال نمبر 4۔ شریعتِ اسلامیہ میں ثبوت (Evidence) اور معاہدات (Contracts) کے نظریات پر ایک جامع نوٹ لکھیں۔ (20)

تعارف

کسی بھی قانونی نظام کی اصل طاقت اس کے دو ستونوں سے ظاہر ہوتی ہے: پہلا یہ کہ حق ثابت کیسے ہو گا، یعنی نظام ثبوت کیا ہے، اور دوسرا یہ کہ لوگوں کے باہمی وعدے اور لین دین کس اصول پر قائم ہوں گے، یعنی نظریہ معاہدہ کیا ہے۔ شریعت اسلامیہ نے ان دونوں شعبوں میں اتنے جامع اصول دیے ہیں کہ فقہاء نے دعویٰ، گواہی، اقرار، قسم، دستاویز اور معاہدے کے ارکان و شرائط پر مستقل ابواب باندھے ہیں۔ اس جواب میں پہلے نظریہ ثبوت کا مفہوم، اس کی اقسام اور اصول بیان کیے جائیں گے، پھر نظریہ معاہدہ کی تعریف، ارکان، شرائط اور اقسام کی وضاحت ہو گی اور آخر میں دونوں نظریات کے باہمی تعلق اور مقاصد شریعہ سے ان کے ربط پر نتیجہ اخذ کیا جائے گا۔ یہ موضوع محض عدالتی بحث نہیں، روزمرہ کے لین دین، کاروبار اور خاندانی زندگی سب اسی سے نظم پاتے ہیں۔

اسلامی نظریہ ثبوت کا بنیادی اصول یہ ہے کہ الزام لگانے والے پر ثبوت کی ذمہ داری ہوتی ہے اور مدعا علیہ اصل میں بری الذمہ سمجھا جاتا ہے جب تک اس کے خلاف شرعی ثبوت نہ آ جائے۔ یہ اصول آج کے جدید قانون کے اس تصور سے ہم آہنگ ہے کہ ملزم کو اس وقت تک بے گناہ سمجھا جائے جب تک جرم ثابت نہ ہو۔ اسی طرح اسلامی نظریہ معاہدے کی بنیاد یہ ہے کہ بالغ و عاقل انسان اپنی رضامندی سے جو جائز وعدہ و پیمان کرے وہ اللہ کے نزدیک بھی محترم ہے اور اس کی پابندی دینی فریضہ ہے۔ قرآن مجید نے ایفائے عہد کا بار بار حکم دیا ہے اور معاہدوں کو لکھنے، گواہ بنانے اور امانت کی حفاظت کی ہدایات دی ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے نظام عدل کو عبادت و تقویٰ سے جوڑ کر دیکھا ہے۔

نظریہ ثبوت: مفہوم اور اہمیت

ثبوت کا لغوی مطلب ہے کسی بات کا پختہ اور پائیدار ہونا۔ اصطلاحاً ثبوت یا بینہ اس دلیل کو کہتے ہیں جس سے عدالت کے سامنے کسی حق یا کسی بات کا دعویٰ ثابت ہو جائے۔ فقہ میں ثبوت کی اہمیت اس لیے بنیادی ہے کہ حق کی حفاظت عدالت کے ذمے ہے، عدالت غیب نہیں جانتی، اس لیے فیصلہ ظاہری شرعی دلائل پر ہی ہو گا۔ اسی بنیاد پر فقہاء نے یہ قاعدہ مقرر کیا کہ بینہ مدعی پر ہے اور قسم مدعا علیہ پر، یعنی جس نے دعویٰ کیا وہ ثبوت پیش کرے اور اگر وہ ثبوت نہ دے سکے تو انکار کرنے والے سے قسم لی جا سکتی ہے۔ اس اصول نے ہر بے بنیاد دعوے کا راستہ بند کیا اور کمزور کو بھی طاقت ور کے خلاف حق دلوایا، بشرطیکہ اس کے پاس دلیل ہو۔ یوں اسلامی نظام ثبوت کا مقصد حق تک پہنچنا ہے مگر ظلم کے بغیر، اور یہی توازن مقاصد شریعہ میں عدل کی حفاظت کا تقاضا ہے۔

اسلامی ثبوت کا ایک اور امتیاز یہ ہے کہ اس میں لکھنے اور دستاویز کو بڑی اہمیت دی گئی ہے۔ سورہ بقرہ کی طویل آیت میں قرض کے معاملات کو لکھنے، لکھنے والے کو عدل سے لکھنے اور مردوں یا عورتوں کو گواہ بنانے کی مفصل ہدایات دی گئی ہیں۔ یہ ہدایات بتاتی ہیں کہ اسلام صرف زبانی روایت پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ پیشگی احتیاط کے نظام بھی سکھاتا ہے، تاکہ بعد میں جھگڑے کی نوبت ہی کم آئے۔ سچی گواہی کو گناہ چھپانے سے بچانے، گواہ کو نقصان نہ پہنچانے اور گواہی کو اللہ کے لیے قائم کرنے کی تلقین سے معلوم ہوتا ہے کہ ثبوت محض تکنیکی شعبہ نہیں بلکہ اخلاقی فریضہ بھی ہے، جس کی خلاف ورزی آخرت میں بھی جواب دہی رکھتی ہے۔

ثبوت کے ذرائع واقسام

فقہاء نے ثبوت کے ذرائع کو عام طور پر چند بنیادی صورتوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلی اور مضبوط صورت اقرار ہے، یعنی کسی شخص کا اپنے خلاف کسی حق کو خود تسلیم کر لینا۔ اقرار کو دلائل کا سردار اس لیے کہا جاتا ہے کہ انسان عام طور پر اپنے خلاف غلط بات تسلیم نہیں کرتا، بشرطیکہ وہ بالغ، عاقل اور بلا جبر اقرار کرے؛ بچے، مجنون اور مجبور کیے گئے شخص کا اقرار معتبر نہیں ہوتا۔ دوسری صورت شہادت یعنی گواہی ہے جس میں عادل گواہ اپنے مشاہدے کی بنیاد پر عدالت کے سامنے بیان دیتے ہیں۔ معاملات، حدود اور دیگر دعوؤں میں گواہوں کی تعداد و شرائط میں فرق ہے جسے فقہ نے ہر باب میں الگ بیان کیا ہے۔ گواہ کی عدالت، یعنی اس کا دیانت دار اور جھوٹ سے بچنے والا ہونا، گواہی کی قبولیت کی بنیادی شرط ہے۔

تیسری صورت قسم یا یمین ہے جو اس وقت کام آتی ہے جب مدعی کے پاس مکمل بینہ نہ ہو۔ چوتھی صورت تحریر و دستاویز ہے جس کی اہمیت زمانہ رسالت ہی سے مسلم ہے اور آج کے جدید ثبوتی نظام میں بھی مرکزیت اسی کو حاصل ہے۔ پانچویں صورت قرائن و علامات ہیں جن کی تفصیل میں فقہاء نے احتیاط کی ہے؛ عدالت ایسے اشارے دیکھ سکتی ہے جو علم و یقین میں مدد دیں، مگر حدود جیسے حساس معاملات میں قرائن کو اس بلند ثبوت کا متبادل نہیں بنایا گیا جس کی شریعت نے شرط رکھی ہے۔ اس کے علاوہ نکول یعنی مدعا علیہ کا قسم سے انکار، قسامت جیسے مخصوص ابواب کی صورتیں اور اہل خبرہ کی رائے بھی بعض مسائل میں معاون ذرائع کے طور پر ذکر ہوئی ہیں۔ یہ تمام ذرائع مل کر ایک ایسا متوازن نظام بناتے ہیں جس میں حق بھی تلف نہ ہو اور محض شکوک پر کسی کو سزا و نقصان بھی نہ ہو۔

جدول: اسلامی نظام ثبوت کے بڑے ذرائع

ذریعہ	مفہوم	بنیادی شرط
اقرار	اپنے خلاف حق کا اعتراف	بلوغت، عقل اور بلا جبر ہونا
شہادت	گواہوں کا عدالتی بیان	گواہ کا عادل اور حاضر العین بیان

بینہ کی عدم موجودگی میں استعمال	مدعاعلیہ کی قسم	یمین
واضح، مستند اور غیر مشکوک تحریر	لکھی ہوئی دستاویز و معاہدہ	تحریر
احتیاط؛ حدود میں بنیادی ثبوت کا متبادل نہیں	حالات و علامات سے استدلال	قرائن

نظریہ معاہدہ: مفہوم اور ارکان

معاہدہ جسے فقہ میں عقد کہتے ہیں، لغت میں گرہ باندھنے اور پختہ کرنے کو کہتے ہیں۔ اصطلاح میں دو یا زیادہ فریقین کے اس باہمی پیمان کو کہتے ہیں جس سے ان پر شرعی و قانونی اثرات مرتب ہوتے ہیں، جیسے خرید و فروخت میں ملکیت کی منتقلی، نکاح میں ازدواجی حقوق کا قیام اور اجارے میں منفعت کا تبادلہ۔ اسلامی نظریہ معاہدے کی روح آزاد رضامندی ہے؛ زبردستی، دھوکے اور فریب سے کیا گیا سودا اسلام کی نظر میں کمزور اور قابل اعتراض ہے۔ اسی لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات میں باہمی رضامندی سے تجارت کو اصل قرار دیا گیا اور ایفائے عہد کو اہل ایمان کی صفت بتایا گیا۔ جدید قانون کا یہ بنیادی اصول کہ معاہدے مقدس ہیں اور ان کی پابندی لازم ہے، اسلامی فقہ میں بہت پہلے سے اسی صورت میں موجود ہے، فرق یہ ہے کہ اسلام میں اس پابندی کو دنیاوی قانون کے ساتھ اخروی جواب دہی سے بھی جوڑا گیا ہے۔

عقد کے ارکان میں عام طور پر تین چیزیں شمار کی جاتی ہیں: عاقدین یعنی معاہدہ کرنے والے فریق، معقود علیہ یعنی وہ چیز، حق یا منفعت جس پر عقد ہو رہا ہے، اور صیغہ یعنی ایجاب و قبول کے الفاظ یا کوئی ایسا عمل جس سے رضامندی واضح ہو جائے۔ شرائط میں عاقدین کی اہلیت یعنی بلوغت و عقل و اختیار، موضوع کا جائز، موجود یا قابل حصول اور معلوم ہونا اور رضامندی کا ہر قسم کے اکراہ و بڑے دھوکے سے خالی ہونا شامل ہے۔ اگر موضوع حرام ہو، جیسے شراب یا سود کی بنیاد پر سودا، یا اس میں اتنی جہالت ہو کہ بعد میں جھگڑا یقینی ہو تو عقد شریعت کی نگاہ میں درست نہیں رہتا۔ اسی وجہ سے فقہ نے غرر یعنی بڑی غیر یقینی صورت اور جوا و سود کی ممانعت کو معاہدوں کے باب میں نمایاں جگہ دی ہے تاکہ کمزور فریق کا استحصال نہ ہو اور مارکیٹ میں اعتماد قائم رہے۔

معاہدات کی اقسام اور اصولِ ایفا

معاہدات کو کئی اعتبار سے تقسیم کیا گیا ہے۔ مقصد کے اعتبار سے تملیک کے معاہدے جیسے بیع و ہبہ، منفعت کے تبادلے کے معاہدے جیسے اجارہ و نکاح، شراکت کے معاہدے جیسے شرکت و مضاربت اور حفاظت و ضمانت کے معاہدے جیسے امانت، وکالت اور رہن۔ اثر کے اعتبار سے بعض معاہدے لازم ہوتے ہیں، یعنی ایک فریق اکیلا انہیں ختم نہیں کر سکتا، اور بعض جائز یا غیر لازم ہوتے ہیں جیسے وکالت و ودیعت جہاں شرائط کے تحت ہر فریق علیحدگی ممکن ہوتی ہے۔ صحت کے اعتبار سے صحیح، فاسد اور باطل کی تقسیم بھی مشہور ہے جس کا دارومدار ارکان و شرائط کی تکمیل پر ہے۔ اسی طرح معاہدوں میں شرائط لگانے کی بھی گنجائش ہے، جائز شرط نافذ ہو گی اور شریعت کے خلاف شرط معاہدے کو فاسد یا اس شرط کو کالعدم کر دے گی، جس سے اسلامی قانون میں فریقین کی آزادی اور شرعی حدود کا توازن ظاہر ہوتا ہے

ایفائے معاہدہ اس نظریے کا عملی پہلو ہے۔ شریعت کے نزدیک عہد توڑنا، وعدہ خلافی کرنا اور امانت میں خیانت کرنا محض قانونی غلطی نہیں بلکہ اخلاقی و دینی جرم بھی ہے۔ ریاست کا کام ہے کہ قراردادوں کے نفاذ کے لیے عدالتیں فراہم کرے اور فریقین کو پابند کرے، جبکہ فریقین کا کام ہے کہ وہ ابہام سے بچیں، شرائط لکھ کر طے کریں اور اختلاف کو حسن نیت سے حل کریں۔ اختلاف کی صورت میں پہلے باہمی مفاہمت، پھر ثالثی و مصالحت اور آخر میں عدالت کی ترتیب اسلامی مزاج سے زیادہ قریب ہے۔ جدید تجارتی دنیا میں کارپوریٹ معاہدے، بینکاری دستاویزات اور بین الاقوامی تجارت بھی انہی اصولوں کے تابع سمجھی جاتی ہے کہ رضامندی سچی ہو، موضوع حلال و معلوم ہو، کسی فریق پر ظلم نہ ہو اور عہد کی پاسداری کی جائے۔

جدول: اسلامی معاہدے کے عناصر

عنصر	مفہوم	خرابی کی صورت
عاقدین	معاہدہ کرنے والے فریق	نااہلیت یا اکراہ سے رضامندی مجروح
معقود علیہ	وہ چیز / حق / منفعت جس پر عقد ہو	حرام، معدوم یا مجہول موضوع

ایجاب وقبول میں عدم مطابقت	ایجاب وقبول سے رضامندی کا اظہار	صیغہ
سود، جوا یا غرر والی شرط	شریعت کے خلاف شرط نہ ہونا	شرعی حد

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ اسلامی نظریہ ثبوت کی بنیاد عدل، براءت اصلیہ اور دلیل پر فیصلہ کے اصول پر ہے اور اس کے بڑے ذرائع اقرار، شہادت، یمین، تحریر اور قرائن ہیں جن میں سے ہر ایک کی شرائط فقہ نے احتیاط سے مقرر کی ہیں۔ اسلامی نظریہ معاہدہ آزاد رضامندی، موضوع کی حلّت ووضاحت اور ایفائے عہد کی پابندی پر کھڑا ہے اور اس کے ارکان عاقدین، معقود علیہ اور ایجاب وقبول ہیں۔ دونوں نظریات کا باہمی تعلق یہ ہے کہ معاہدہ حق پیدا کرتا ہے اور ثبوت اس حق کو ثابت و نافذ کرتا ہے؛ معاہدے لکھے جائیں اور گواہ بنائے جائیں تو ثبوت آسان ہو جاتا ہے اور ثبوت مضبوط ہو تو معاہدوں کا احترام بڑھتا ہے۔ مقاصد شریعہ کی رو سے یہ دونوں نظام مال، عزت اور حقوق کی حفاظت اور معاشرے میں اعتماد کے قیام کا ذریعہ ہیں، اسی لیے انہیں اسلامی قانون کے سب سے عملی اور زندہ ابواب شمار کیا جاتا ہے۔

AIOU LIBRARY aioulibrary.com

سوال نمبر 5: بدعت — مفہوم، اقسام اور اس کی شرعی وعید (20 نمبر)

سوال نمبر 5۔ بدعت کا مفہوم واضح کریں۔ بدعت پھیلانے اور اس پر عمل کرنے کی شرعی سزا یا وعید پر ایک مفصل نوٹ لکھیں۔ (20)

تعارف

بدعت شریعت اسلامیہ کے ان تصورات میں سے ہے جن پر گفتگو کرتے ہوئے اعتدال اور علمی احتیاط دونوں درکار ہوتے ہیں۔ ایک طرف دین کی اصل صورت کی حفاظت خود مقاصد شریعہ میں شامل ہے، کیونکہ اگر ہر شخص اپنی پسند سے دین میں اضافہ کرنے لگے تو اصل تعلیمات محفوظ نہیں رہتیں۔ دوسری طرف ہر نئی چیز کو بدعت کہہ دینا بھی درست نہیں، کیونکہ دنیاوی وسائل اور طریقہ کار میں جدت خود اسلام کے مزاج کے خلاف نہیں۔ فقہاء و محدثین نے اسی لیے بدعت کی تعریف میں دین میں اضافے کی قید

لگائی اور دنیاوی ایجادات کو اس سے الگ رکھا۔ اس جواب میں پہلے بدعت کا لغوی و اصطلاحی مفہوم، پھر اس کی فقہی تقسیمات و دائرہ کار، پھر بدعت کے پھیلاؤ کے اسباب و نقصانات اور آخر میں قرآن و سنت کی تعلیمات کی روشنی میں بدعت پر عمل اور اس کی اشاعت کے بارے میں وعید و تنبیہ کا علمی بیان نتیجے کے ساتھ پیش کیا جائے گا۔ عملی احکام کے کسی اختلافی معاملے میں قطعی رائے کے لیے مستند علماء سے رجوع کی ہدایت یہاں بھی برقرار ہے۔

اس موضوع کو مقاصد شریعہ کے کورس میں رکھنے کی وجہ واضح ہے۔ مقاصد میں سب سے پہلا مقصد حفاظت دین ہے، اور دین کی حفاظت صرف اس کا دفاع ہی نہیں بلکہ اسے اسی صورت میں باقی رکھنا بھی ہے جس صورت میں وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے۔ سنت کی اتباع اور بدعت سے اجتناب اسی حفاظت کے دو پہلو ہیں۔ تاہم یہ نکتہ بھی علمی امانت کا تقاضا ہے کہ بدعت کا اطلاق ہر اختلافی فروعی مسئلے پر نہیں ہوتا؛ جن مسائل میں اہل سنت کے معتبر فقہی مذاہب کا اختلاف موجود ہے انہیں بدعت کہہ کر امت میں انتشار پھیلانا خود علماء نے ناپسند کیا ہے۔ لہٰذا اس جواب میں بدعت سے مراد دین میں وہ نیا اضافہ ہے جس کی کوئی اصل کتاب و سنت اور سلف کے تعامل میں نہ ہو اور اسے دین و ثواب کی نیت سے رواج دیا جائے۔

بدعت کا لغوی و اصطلاحی مفہوم

بدعت عربی لفظ بدع سے بنا ہے جس کا مطلب ہے کسی چیز کو بے مثال و بے نمونہ پہلی بار پیدا کرنا۔ اسی مادے سے البدیع اللہ تعالیٰ کی صفت کے طور پر بھی استعمال ہوا ہے، یعنی وہ ذات جو آسمانوں و زمین کو بغیر سابق نمونے کے پیدا کرنے والی ہے۔ لغوی اعتبار سے ہر نئی ایجاد بدعت کہلا سکتی ہے، مگر شرعی اصطلاح میں لفظ اپنی لغوی وسعت پر باقی نہیں رہتا بلکہ خاص مفہوم اختیار کر لیتا ہے۔ اسی لیے عربی زبان میں ہر نئی ایجاد پر اس لفظ کا بولا جانا اور شرعی حکم کا اس پر مرتب ہونا دو الگ باتیں ہیں، جن کو ملانا اس بحث کی سب سے بڑی غلط فہمی ہے۔

اصطلاح میں بدعت دین میں اس نئے طریقے یا عمل کو کہتے ہیں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے دور کے بعد دین سمجھ کر ایجاد کیا گیا ہو، جس کی دلیل کتاب و سنت میں اصلاً موجود نہ ہو اور اسے ثواب و قربت کا ذریعہ سمجھ کر اختیار کیا گیا ہو۔ مشہور تعریفات کا خلاصہ یہی ہے کہ بدعت وہ نو ایجاد دینی روش ہے جو شریعت سے مشابہت

رکھتی ہو مگر اس کی سند شریعت میں نہ ہو۔ اس تعریف سے تین چیزیں خارج ہو جاتی ہیں: ایک دنیاوی ایجادات جیسے نئی ٹیکنالوجی، سائنسی آلات اور انتظامی نظام، کیونکہ ان کا تعلق دین کے عبادتی ڈھانچے سے نہیں بلکہ وسائل سے ہے۔ دوسری وہ چیزیں جن کی اصل شریعت میں موجود ہو مگر صورت زمانی اعتبار سے نئی ہو، جیسے دینی کتب کی طباعت، مدارس کا نظام یا اذان کے لیے لاؤڈ اسپیکر، یہ سب اصل دین کے معاون وسائل ہیں۔ تیسری وہ فروعی اجتہادی اختلافات جن میں ہر فریق کے پاس شرعی دلیل موجود ہو، انہیں بدعت نہیں کہا جاتا۔

بدعت کی تقسیمات اور دائرہ کار

علماء نے بدعت کو سمجھانے کے لیے چند تقسیمات بیان کی ہیں۔ ایک معروف تقسیم بدعت لغوی اور بدعت شرعی کی ہے، جس کا حاصل اوپر بیان ہو چکا ہے۔ دوسری تقسیم اعتقادی اور عملی بدعت کی ہے؛ اعتقادی بدعت کا تعلق عقائد میں ایسی بات گھڑنے سے ہے جو اہل سنت کے اجمالی اصولوں سے ٹکرائے، جبکہ عملی بدعت کا تعلق عبادات کی صورت، مقدار، وقت یا کیفیت میں بے اصل اضافے سے ہے۔ بعض علماء نے احکام خمسہ کی روشنی میں بھی تقسیم کی ہے اور بعض نے صورتوں کو ان کے مصلحتی نتائج کے لحاظ سے دیکھا ہے، چنانچہ بعض معاصر و متقدم علماء کی تحریروں میں بدعت حسنہ و سیئہ کی تعبیر بھی ملتی ہے۔ اس سے مراد عام طور پر یہ ہوتی ہے کہ جس نئے طریقے کی اصل شریعت کے کسی عام اصول سے ثابت ہو اسے وسائل کے درجے میں قبول کیا جائے اور جس کا شریعت سے تصادم ہو وہ مردود ہو۔ طالب علم کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس تقسیم کو علمی اختلاف کے دائرے میں سمجھے اور کسی ایک تعبیر کو لے کر معتبر علماء کی دوسری آرا کو رد کرنے میں جلدی نہ کرے۔

دائرہ کار کے تعین میں ایک عملی معیار یہ ہے کہ دیکھا جائے کہ نئی چیز دین کا حصہ بن کر پیش کی جا رہی ہے یا دنیا کے انتظام کے طور پر۔ نماز کی رکعتوں میں اپنی طرف سے اضافہ، کوئی نیا روزہ و حج یا کسی مقررہ دن کو دینی حیثیت سے خاص کرنا ایسی صورتیں ہیں جو دین کے ڈھانچے میں مداخلت بنتی ہیں۔ اس کے مقابلے میں قبرستان کی چار دیواری، مسجد میں جدید نظامت، دینی تعلیم کے لیے آن لائن ذرائع اور قرآن کی اشاعت کے نئے طریقے یہ سب انتظامی و وسائلی امور ہیں جن کا جائزہ مصلحت سے ہوتا ہے۔ یہ فرق سمجھے بغیر

بدعت کی بحث یا تو اتنی وسیع ہو جاتی ہے کہ ہر سہولت مشکوک بن جائے یا اتنی تنگ ہو جاتی ہے کہ اصل اضافے بھی جائز دکھنے لگیں۔ شاطبی جیسے مقاصد کے اماموں نے اسی لیے الاعتصام جیسی کتابوں میں اس موضوع کو بہت تفصیل سے لکھا اور نیت، صورت و نتیجے ہر پہلو کو جانچنے کی تعلیم دی ہے۔

جدول: بدعت کے دائرے کی وضاحت کے لیے مثالیں

وجہ	درجہ	صورت
دین کی مقرر صورت میں مداخلت	بدعتِ شرعی کے دائرے میں	عبادت کی صورت / تعداد میں بے دلیل اضافہ
اجمالی اصولِ دین سے تصادم	بدعتِ اعتقادی	عقیدے میں بے اصل بات گھڑنا
اصل دین کے معاون ذرائع	وسائل؛ اصل بدعت نہیں	طباعت، لاؤڈ اسپیکر، آن لائن تعلیم
نفع و مصلحت سے جانچا جائے گا	دنیاوی تنظیم	مدارس و رفاہی اداروں کے انتظامی نظام

بدعت کے پھیلاؤ کے اسباب اور نقصانات

بدعت کے پھیلاؤ کے اسباب میں جہالت سب سے بڑا سبب ہے؛ جب لوگ اصل دین کا علم نہیں رکھتے تو ہر رسم کو دین سمجھ بیٹھتے ہیں۔ دوسرا سبب آبائی رسم و رواج کی اندھی تقلید ہے کہ جو کام آباؤ اجداد سے چلتا آیا ہے اسے دلیل کے بغیر درست مان لیا جاتا ہے۔ تیسرا سبب خواہشاتِ نفس اور شہرت و آمدنی کا لالچ بھی ہوتا ہے، جہاں نئے نئے اعمال گھڑنے سے لوگوں کی توجہ اور دنیاوی فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ چوتھا سبب غلو یعنی دین داری میں حد سے بڑھ جانا بھی ہے کہ کچھ لوگ نیکی کے شوق میں وہ صورتیں اختیار کر لیتے ہیں جو شریعت نے مقرر ہی نہیں کیں۔ اس کے نقصانات یہ ہیں کہ اصل سنت آہستہ آہستہ پس منظر میں چلی جاتی ہے، امت میں تفرقہ پیدا ہوتا ہے، لوگ اصل فرائض چھوڑ کر نوافل نما رسموں میں مشغول ہو جاتے ہیں اور غیر مسلموں کے سامنے دین کی غلط تصویر پیش ہوتی ہے۔ حفاظتِ دین کے مقصد کا تقاضا یہی ہے کہ ان اسباب کو علم کی اشاعت سے روکا جائے نہ کہ محض الزام تراشی سے۔

بدعت پر عمل واشاعت کی شرعی وعید

سنت کی تعلیمات میں بدعت کی سخت مذمت آئی ہے۔ احادیث میں دین میں نئی بات گھڑنے کو رد کر دیا گیا ہے اور ہر ایسی نو ایجاد دینی روش کو گمراہی سے تعبیر کیا گیا ہے جو شریعت کی اصل سے بے سند ہو۔ اس وعید کا مقصد یہ بتانا ہے کہ اللہ کی رضا اسی عمل میں ہے جو اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے کے مطابق ہو؛ جو عمل اس دائرے سے باہر گھڑا جائے گا وہ اگرچہ بظاہر نیکی لگے مگر قبولیت کی سند نہیں رکھتا۔ علماء نے اس مذمت کو اس شخص کے لیے زیادہ شدید قرار دیا ہے جو خود عمل کرنے کے ساتھ دوسروں کو بھی اس کی دعوت دے اور اسے رواج دے، کیونکہ اس صورت میں ایک غلط روش نسل در نسل چلتی ہے اور اس کے برے اثرات کا سلسلہ پھیلانے والے تک بھی لوٹتا ہے۔ اخلاقی واخروی وعید کے علاوہ دنیاوی تعزیر کا سوال عدالت وریاست کے دائرے کا ہے؛ اگر کوئی عمل ریاست کے ساتھ ساتھ کھلے فساد، فرقہ واریت یا حقوق العباد کی تلفی کا سبب بنے تو اس پر قانونی کارروائی کا فیصلہ اہل اختیار ہی قانون کے مطابق کرتے ہیں، افراد کو خود کوئی سزا دینے کا اختیار نہیں۔

یہاں نتیجے کے طور پر اعتدال کی راہ بھی واضح رہے۔ وعید کا یہ بیان ہر اختلافی مسئلے کو بدعت کا فتویٰ لگانے کی اجازت نہیں دیتا۔ جس عمل کی اصل فقہ کے کسی معتبر مکتب یا دلیل سے ثابت ہو اس پر بدعت کا اطلاق علماء کے نزدیک درست نہیں۔ اسی طرح کسی شخص کے بارے میں حتمی دینی فیصلہ، تکفیر یا اس کے انجام کا اعلان کرنا عام آدمی کا کام نہیں، یہ مستند علماء اور اہل اختیار کے دائرے کی باتیں ہیں۔ مومن کا کام یہ ہے کہ خود سنت کو سیکھے، اس پر عمل کرے، علم کی اشاعت سے اصلاح کی کوشش کرے اور کسی اختلافی معاملے میں الجھنے کے بجائے اہل علم سے رجوع کرے۔ بدعت کے نقصان سے بچنے کا سب سے مؤثر ذریعہ قرآن وسنت کا صحیح علم، علماء اہل سنت سے رابطہ اور فرائض وسنتوں کی پابندی ہے، یہی حفاظت دین کے مقصد کی عملی صورت ہے۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ بدعت لغت میں ہر نئی ایجاد کو کہتے ہیں مگر شرعی اصطلاح میں یہ دین میں وہ بے اصل اضافہ ہے جسے دین وثواب سمجھ کر رواج دیا جائے اور اس کی سند کتاب و سنت میں نہ ہو۔ دنیاوی وسائل، انتظامی جدتیں اور دلیلی اجتہادی اختلافات اس کے دائرے سے باہر ہیں۔ بدعت کے پھیلاؤ کے بڑے اسباب جہالت، اندھی تقلید، خواہش و

مفاد اور غلو ہیں اور اس کے نقصانات سنت کا مٹنا، امت کا تفرقہ اور اصل دین کی صورت بگڑنا ہے۔ سنت کی تعلیمات میں بدعت کو ردو گمراہی قرار دے کر اس پر عمل واشاعت کی سخت اخروی وعید آئی ہے، جبکہ کسی دنیاوی سزا یا کسی شخص کے بارے میں قطعی فیصلہ صرف اہل اختیار اور مستند علماء کا کام ہے۔ طالب علم کے لیے اصل سبق یہ ہے کہ وہ نیت کی اخلاص کے ساتھ سنت کی پیروی کو اپنا معیار بنائے اور علمی اختلافات میں فتوے بازی کے بجائے علم ورجوع الی العلماء کا راستہ اختیار کرے۔

AIOU LIBRARY
aioulibrary.com